اَلْحَمْدُلِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر:28)

وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِی مَقَامٍ اٰخَرْ

یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْم (الانفطار:6)

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

علمِ شرعی اور علم الاحسان:

علم کی دو حیثیتیں ہیں۔ایک ظاہری صورت ہے جس سے احکام کی بجا آوری کا پتہ چلتا ہے اور ایک اس کی تاثیر ہے جس سے انسان کا باطن سنورتا ہے۔ پہلے علم کو علم شرعی کہتے ہیں اور دوسرے علم کو علم الاحسان کہتے ہیں۔

ہمارے سلف صالحین نے قرآن مجید سے استنباط کر کے کئی علوم نکالے اور ان کے مختلف نام رکھے۔علمائے امت نے ان کو ''امام'' کہا۔جیسے امام اعظم ابوحنیفہؒ،امام شافعیؒ اور اسی طرح دوسرے حضرات ہیں۔بالکل اسی طرح کچھ مشائخ عظام بھی ایسے تھے جنہوں نے قرآن وحدیث پر غور کر کے علم الاحسان کو یکجا کر دیا۔ان کو بھی علمائے امت نے ''امام'' مانا۔جیسے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ،خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ،حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی بخاریؒ

تصوف وسلوک کے لیے علم کی ضرورت:

سید الطائفہ جنید بغدادیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تصوف وسلوک کے لیے علم کا ہونا ضروری ہے۔وہ فرماتے ہیں:

مَنْ لَّمْ یَقرَءِ الْقُرْاٰنَ وَلَمْ یَکْتُبِ الْحَدِیْثَ لَایُقْتَدٰی بِہٖ فِیْ ھٰذَا الْاَمْرِ

''جو بندہ قرآن نہیں پڑھتا اور حدیث کا علم حاصل نہیں کرتا وہ اس قابل نہیں کہ دین کے معاملے میں اس کی اقتدا کی جائے۔''

چنانچہ ذکر و سلوک کے راستے میں علم کا ہونا ضروری ہے۔

حصولِ علم کے لیے مشائخ کی ترغیب:

طبقہ ءِ اوّل کے مشائخ اپنے مریدین کو علم حاصل کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ مکتوبات میں لکھا ہے:

''سالک کو علم حاصل کیے بغیر اس راستے میں قدم نہیں رکھنا چاہیے، ورنہ کافر اور مجنون ہونے کا خطرہ ہے۔''

ابن جوزیؒ جیسے ناقد محدث اور بزرگ اپنی کتاب ''تلبیس ابلیس'' میں لکھتے ہیں:

وَمَا کَانَ الْمُتَقَدِّمُوْنَ فِیْ التَّصَوُّفِ اِلَّا رُءُوْسٌ فِیْ الْقُرْآنِ وَالْفِقْہِ وَالْحَدِیْثِ

''جو تصوف کے متقدمین (بڑے حضرات) تھے، یہ وہی تھے جو علوم تفسیر، فقہ اور حدیث میں بھی اپنے وقت کے امام تھے۔''

اسی لیے حسن بصریؒ جہاں تصوف کے امام سمجھے جاتے ہیں، وہاں ان کی احادیث آپ کو بخاری شریف میں بھی نظر آئیں گی۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قَالَ الْحَسَنُ الْبَصَرِیُّ

جہالت، دشمنی کا سبب ہے:

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ لوگ اتنا علم رکھتے تھے تو پھر ان پر اتنے اعتراضات کیوں کیے

گئے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کا کلام چونکہ معارف پر مبنی ہوتا تھا، اشارات پر مبنی ہوتا تھا، اس لیے ہر بندے کے اندر اتنی استعداد نہیں ہوتی تھی کہ وہ اس کو سمجھ سکے۔اور اصول یہ ہے:

اَلنَّاسُ اَعدَاءٌ لِّمَا جَھِلُوْا

''جب لوگوں کو کسی چیز کا علم نہیں ہوتا تو وہ اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔''

کچھ ایسے بھی لوگ تھے جنہوں نے ان کے اقوال کو اپنے مطالب اور مفاہیم کا لباس پہنا دیا اور ان پر فتوے لگا دیے۔یعنی بات ان کی اور مفہوم اپنا۔اس کو کہتے ہیں: ''تَوْجِیْہِ الْقَوْلُ بِمَا لَا یَرْضٰی بِہِ الْقَائِلُ '' کہنے والے نے اس مقصد کے لیے بات نہیں کی، مگر الزام لگانے والے نے اپنے معانی پہنا کر اس کا ایک مطلب نکال لیا۔

اس کی ایک آسان سی مثال ہمارے اکابرین علمائے دیوبند ہیں۔ان کی کتب کی تحریروں کو سیاق وسباق سے کاٹ کر ایسے معانی دے دیے گئے کہ ان پر گستاخ رسول کا فتوی لگا دیا گیا۔ہر دور اور ہر زمانے میں ایسا ہوتا ہے۔

صوفیا کے حالات پر مبنی علما کی کتابیں:

یہ بھی عجیب بات ہے کہ اللہ رب العزت نے ہر دور اور ہر زمانے میں ایسی عبقری شخصیات کو پیدا فرما یا دیا جنہوں نے مشائخِ صوفیاء کے قدسی نفوس کو لوگوں کے سامنے منقع بنا کر پیش کیا۔چنانچہ محدثین اور بڑے بڑے علما نے بھی کتابیں لکھیں۔

☆ابنِ جوزیؒ نے خود ''صفوۃ الصفوہ'' کتاب لکھی، جس میں مشائخ صوفیاء کے احوال لکھے۔

☆علامہ شمس الدین ذہبیؒ نے ''سیر اعلام النبلاء'' ایک کتاب لکھی۔

☆عبدالرحمٰن محدث دہلویؒ نے ''اخبارالاخیار'' کے نام سے کتاب لکھی۔

☆علامہ عبدالوہاب شعرانیؒ فقیہ بھی تھے اور صوفی بھی تھے۔انہوں نے تصوف پر ''الطبقات الکبریٰ'' کتاب لکھی اور مشائخ کے حالات اکٹھّے کیے۔اور فقہ میں ان کی دو کتابیں ''کشف الغمہ'' اور ''میزان الکبریٰ'' اپنی مثال آپ ہیں۔

☆امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہؒ واللہ رب العزت نے یہ اعزاز بخشا ہے کہ انہوں نے تصوف پر ہونے والے تمام اعتراضات کے شافی جواب دیے۔

☆پھر جو کچھ رہی سہی کسر تھی اس کو حکیم الامت حضرت اقدس تھانویؒ نے بالکل صاف کر دیا۔چنانچہ ان کی تفسیر ''بیان القرآن'' کے حاشیے پر ''مسائلِ سلوک'' کے نام سے آپ کو معارف کا ایک خزانہ ملے گا۔انہوں نے تصوف وسلوک کے راز اور باتوں کو قرآن وحدیث سے ثابت کیا۔

کیا تصوف عجمی چیز ہے؟

الحمدللہ! ہمارا راستہ اعتدال کا راستہ ہے۔افراط وتفریط سے پاک ہے۔آج دنیا میں کچھ ایسے صوفی لوگ بھی موجود ہیں جو ''العلم حجاب الاکبر'' کا نام لے کر لوگوں کو علما سے دور رکھتے ہیں۔ضَلُّوْا فَاَضَلُّوْا۔وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔اور کچھ لوگ وہ ہیں جو تصوف کو عجمی چیز سمجھتے ہیں۔وہ کہتے ہیں: یہ عرب کی نہیں عجم کی چیز ہے۔اس کا تعلّق یونان کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ احادیث میں جو احسان کا نام ہے وہ بھی کسی بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔وہ بے حضور نمازیں پڑھتے ہیں مگر ان کو یہ توفیق نہیں ملتی کہ کسی کی خدمت میں آکر نماز کو سیکھنے کی کوشش کریں۔ہمارے اکابرین علمائے دیوبند نے اعتدال کا راستہ اپنایا

درکفِ جامِ شریعت درکفِ سندانِ عشق

ہر ہوس ناکے باخدا

یہ ہر بندے کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ چنانچہ اجتماع کے بقیہ بیانات میں

.....نماز کیسے بنائی جائے؟

.....تشکیلِ کردار۔

.....قرآن مجید کی تلاوت کیسے ہونی چاہیے

جیسے اہم موضوعات پر بھی بات کی جائے گی۔

میر جمع ہیں احباب درِ دل کہہ دے

پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

دو آیات میں حیران کن تطبیق:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (الانفطار:6) ''اے انسان! تجھے تیرے کریم پروردگار سے کس چیز نے دھوکے میں ڈال دیا؟''

اس آیت کے معانی پر غور کیجیے..... جب لاڈلا بچہ روٹھ جائے تو ماں اسے ناز و انداز اور پیار کے ساتھ مناتی ہے کہ تو کیوں روٹھ گیا ہے۔ اللہ رب العزت کی رحمتوں پر قربان جائیں کہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے انسانوں کو متوجہ فرماتے ہیں یہ کتنا پیار بھرا انداز ہے!!

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (الانفطار:6)

یہاں پر اللہ رب العزت نے ''یا'' کا لفظ استعمال فرمایا۔ یہ حرفِ ندا کہلاتا ہے۔ جب کوئی دور ہو تو اس لفظ سے اس کو پکارا جاتا ہے۔ اس لیے معلوم ہوا کہ بندہ دور ہے۔ لیکن قرآن پاک کی ایک دوسری آیت ہے:

وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (قٓ:16)

''ہم تو اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔''

اب اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ پروردگار تو رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے اور حرفِ ندا ''یا'' سے پتہ چلتا ہے کہ دور ہے۔ علما نے ان میں تطبیق دی کہ انسان علم کے لحاظ سے اللہ کے قریب ہے اور صفات کے لحاظ سے اللہ سے بعید ہے۔

لفظ ''انسان'' کے معارف:

انسان کا لفظ بھی عجیب ہے۔ علما نے اسکے تین معانی لکھے ہیں:۔

(۱).....انسان کا لفظ ''اُنس'' سے نکلا ہے۔ اُنس کہتے ہیں محبّت کو۔

(۲).....انسان کا لفظ ''نسیان'' سے نکلا ہے۔ نسیان کہتے ہیں بھولنے کو۔

(۳).....انسان کا لفظ ''اٰنَس'' سے نکلا ہے

اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا (القصص:29)

اٰنَس کا مطلب اَبْصَرَ یٰ/اَبصَرَ ''دیکھنا''

گویا انسان کے تین معانی بنے:۔

(۱).....محبّت کرنے والا

(۲).....بھولنے والا

(۳).....دیکھنے والا

ہمارے مشائخ نے فرمایا تینوں معانی انسان پر صادق آتے ہیں کہ یہ انسان اللہ رب العزت سے محبّت کرتا ہے تو اللہ رب العزت اس پر اپنے انوار و تجلّیات کی بارش کر دیتے ہیں اور جب یہ اس کے انور و تجلّیات کو دیکھتا ہے تو پھر پوری دنیا کو بھول جاتا ہے۔

لفظِ ''رب'' کا اطلاق:

آگے فرمایا:

غَرَّكَ ''تجھے دھوکے میں ڈال دیا''

بِرَبِّكَ ''تیرے رب سے''

رب کہتے ہیں اس ذات کو جو کسی کی پرورش کرے۔ یہ لفظ ماں باپ کے لیے بھی بولتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (بنیٓ اسرآئیل:24)

حضرت یوسفؑ نے بھی کہا تھا:

اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ (یوسف:42)

یعنی ''رب'' کا لفظ مخلوق کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور خالق کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مگر اس کے استعمال میں فرق ہے۔

اللہ رب العزت کی ربوبیت زمان و مکان کی قید سے بلند و بالا ہے۔ چنانچہ اللہ رب العزت کے لیے

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ(الدخان:7) کہا گیا۔مزید فرمایا:

رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآءِ كُمُ الْاَ وَّلِيْنَ (الدخان:8)

''جوتمہارا ابھی رب ہے اورتم سے پہلے جوتمہارے آباء گزرے ہیں ان کا بھی رب ہے۔''

تو وہاں زمان ومکان کی قید کا کوئی دخل نہیں۔البتہ ماں باپ جو مربّی ہوتے ہیں وہ محدود وقت کے لیے ہوتے ہیں۔اور خاص افراد کے لیے ہوتے ہیں۔

پالنے والا کون ہے؟

''رب'' کا مطلب ہے''پالنہار''(پالنے والا) ضروریات کو پورا کرنے والا۔آج کا ایک بڑا دھوکہ یہ ہے کہ انسان نے اسباب کو اپنا رب سمجھ لیا ہے۔

کسی نے اپنی دکان کو

کسی نے دفتر کو

کسی نے تعلیم کو

کسی نے کاروبار کو

اسی لیے شریعت کے احکام توڑ دیتے ہیں مگر ان چیزوں پر آنچ نہیں آنے دیتے۔کاروبار کی وجہ سے سو دپر کام کرنا پڑے تو کر لیں گے۔جب شریعت کو چھوڑ کر دنیا کے پیچھے لگ گئے تو گویا اس چیز کو انہوں نے اپنا رب سمجھ لیا۔یہ بھی صنم پرستی ہے۔بت فقط پتھر کے نہیں ہوتے،خیال کے بھی ہوتے ہیں۔

بتوں کو توڑ تخیّل کے ہوں یا پتھر کے ان پر ضربِ ابراہیمی لگانی پڑتی ہے۔

یہ قوم اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

اگر اللہ رب العزت کی ذات سے نگاہیں ہٹ کر مخلوق پر آجائیں تو گویا انسان اپنے راستے سے بھٹک گیا۔

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نا امیدی مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

دنیا و آخرت کی سعادتیں:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے انعام یافتہ بندوں کا تذکرہ فرمایا:

أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (النسآء:69)

یہ چار قسم کے لوگ میرے انعام یافتہ بندے ہیں۔ انبیا، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

ان میں سے پہلے دو کا زیادہ تعلّق علم کے ساتھ ہے۔ نبی علیہ السّلام وحی لے کر آئے اور صدیق نے ان کی تصدیق کی۔ گویا انبیا اور صدیقین میں علم کی نسبت غالب ہے۔

شہدا اور صالحین میں عمل کی نسبت غالب ہے۔

اسی آیت سے معلوم ہوا کہ کائنات کی سعادتیں اللہ رب العزت نے علم اور عمل کے اندر رکھی ہوئی ہیں۔ اگر ہم بھی اللہ رب العزت کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی علم اور عمل کے راستے پر چلنا ہوگا۔

عدیم العلم، قلیل العلم اور علیل العلم:

انسان کے علم کا حال بھی عجیب ہے۔ جب دنیا میں پیدا ہوا تو بچہ تھا۔ علم نہیں تھا.....قرآن عظیم الشان میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا (النحل:78)

''تم اپنی ماں کے پیٹ میں تو تمہارے پاس علم نہیں تھا۔''

یعنی ابتدا میں انسان ''عدیم العلم'' تھا۔اس کے پاس علم نہیں تھا۔

پھر دنیا میں آیا اور کتابیں پڑھیں۔جو کچھ بھی پڑھا وہ محدود ہے۔اس لیے قرآن پاک میں فرمایا:

وَ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (بنیٓ اسرآئیل:85)

گویا جوانی میں ''قلیل العلم'' بنے۔

اور جب بڑھاپا آیا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم ایک ایسی عمر کو پہنچ گئے کہ

لِكَیْلَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا (النحل:70)

اس کو کہتے ہیں ''علیل العلم''یعنی جو علم تھا وہ بھی رخصت ہو گیا۔بھول گیا۔

جب انسان ابتدا میں عدیم العلم، درمیان میں قلیل العلم اور آخر میں علیل العلم ہو تو پھر یہ اپنے علم پر کیا ناز کرے۔

علمِ لدنی کے اہل کون؟

یہ طے شدہ بات ہے کہ اللہ رب العزت کسی جاہل انسان کو ولایت خاصہ عطا نہیں فرماتے۔البتہ اگر انسان کے پاس علمِ ظاہری نہیں بھی ہوگا اور وہ انسان اپنے دل پر محنت کرے گا تو اللہ رب العزت اس کو علمِ لدنی عطا فرما دیں گے اور اس کا شمار علما میں کیا جائے گا۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَاۤ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (الکھف:65)

حبیب عجمیؒ اور علم لدنی:

حبیب عجمیؒ بالکل ان پڑھ تھے۔ان کے سامنے جب قرآن مجید کی آیت تلاوت کی جاتی تھی تو وہ پہچان لیتے تھے اور جب حدیث پاک بیان کی جاتی تھی تب بھی پہچان لیتے تھے۔حتی کہ کسی کا قول بیان کیا جاتا تھا تو وہ بھی پہچان لیتے تھے۔لوگ حیران ہوکر کہتے کہ جی آپ کو کیسے پتہ چل جاتا ہے۔وہ فرماتے تھے:

☆جب قرآن کی آیت پڑھی جاتی ہے تو ایک ایسا نور ظاہر ہوتا ہے کہ جس سے میں پہچان لیتا ہوں کہ یہ میرے مولا کا کلام ہے۔

☆جب حدیث پاک پڑھی جاتی ہے تو ایک اور قسم کا نور ہوتا ہے۔

☆جب دوسری مخلوق کی باتیں ہوتی ہیں تو ان کے اندر نور ہی نہیں ہوتا۔

تو میں اس نور کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے یا محبوب ﷺ کا فرمان ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو علمِ لدنی حاصل تھا۔

مسجد نبوی کی ابتدائی حالت:

آپ حضرات اجتماع کے یہ تین دن بڑے ذوق اور شوق کے ساتھ گزاریے۔آپ کو ابھی مجاہدہ کرنا پڑے گا۔اس سے نہ گھبرائیے کہ جگہ تنگ ہے۔ہمارے دلوں میں جگہ بہت زیادہ ہے۔مسجد نبوی بھی شروع میں اتنی چھوٹی سی تھی کہ نبی علیہ السّلام نے فرمایا:

''مجھے ایک ایسا چھپر بنا دو جیسے موسیٰ علیہ السّلام کا تھا۔''

بارش کے وقت میں نیچے پانی آتا تھا۔لوگ سجدے کرتے تو ان کی پیشانیوں پر کیچڑ لگ جاتا تھا۔

علما کو آگے جگہ دینے میں عوام کا فائدہ:

اگلی صفوں میں جو علما اور صلحا کو جگہ دی جاتی ہے اس میں بھی حکمت ہے۔عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ایک صحابی

رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ یہود کے بڑے علما میں سے تھے۔ انہوں نے اسلام قبول کیا اور صحابی رسول بن گئے۔ ان کو اللہ تعالیٰ دو انبیا پر ایمان لانے کی وجہ سے بہت بڑا درجہ عطا فرمائیں گے۔

وہب بن منبہؒ ان کے شاگرد تھے۔ وہ فرماتے ہیں: میں نے دیکھا کہ جب نماز کا وقت ہوتا تو ان کی کوشش ہوتی تھی کہ دوسرے لوگوں کو آگے جگہ ملے اور میں پیچھے کھڑا ہو کر نماز پڑھوں۔ فرماتے ہیں کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ پہلی صف میں نماز پڑھنے کے اتنے فضائل ہیں کہ اگر لوگوں کو اس کی فضیلت کا پتہ چل جائے تو لوگ ایک دوسرے سے مقابلہ شروع کر دیں، الجھنا شروع کر دیں، اور ان کو جب اگلی صفوں میں کھڑے ہونے کا موقع ملتا بھی ہے تو وہ دوسروں کو آگے کر دیتے ہیں اور خود پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے ان سے پوچھ لیا کہ جی آپ کا یہ عمل کس بنیاد پر ہے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ میں تورات کا عالم ہوں۔ اس میں اس امت کی نشانیاں بتائی گئی ہیں۔ ان نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ تھی کہ اس امت میں بعض ایسے اللہ والے ہوں گے کہ جب وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھیں گے تو ان کے پیچھے جتنے لوگ سجدہ کریں گے اللہ تعالیٰ ان سب کے گناہوں کی مغفرت فرما دیں گے۔

اس لیے جب علما اور صلحا کو آگے جگہ دی جاتی ہے تو اس میں آپ ہی کا فائدہ ملحوظ ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کا سجدہ ہماری مغفرت کا سبب بن جائے۔

دل چاہتا ہے ایسی جگہ میں رہوں جہاں جیتا ہو کوئی درد بھرا دل لیے ہوئے

یہ حضرات دور دور سے درد بھرا دل لے کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا بڑا مقام ہے۔

فضائل اور مسائل کا علم:

علم دو طرح کا ہے۔ ایک فضائل کا اور ایک مسائل کا۔ فضائل کے علم سے انسان اعمال پر آتا ہے اور

مسائل کے علم سے انسان اعمال کو بناتا ہے۔

عیش الدنیا والاخرۃ کے مصداق کون؟

علم، عمل اور عبدیت، یہ تینوں الفاظ ''ع'' سے شروع ہوتے ہیں۔اور عیش کا لفظ بھی ''ع'' سے شروع ہوتا ہے، جیسے:

اَللّٰھُمَّ لاَعَیْشَ اِلَا عَیْشَ الْاٰخِرَۃِ

معلوم یہ ہوا کہ جس نے علم پر عمل کیا اور اسے مقامِ عبدیت نصیب ہوا، اللہ تعالیٰ اس کو ''عیش الدنیا والاخرۃ'' عطا فرمائیں گے۔

روایت حدیث میں سماع کی ضرورت:

علم کا زیادہ تعلّق ''سماع'' کے ساتھ ہے۔سننا اسی لیے محدثین تسلسلِ روایت اسے ہی سمجھتے ہیں کہ اپنے استاد سے باقاعدہ اس نے سنا ہو۔فرض کریں استاد کے پاس ایک کتاب لکھی ہوئی تھی۔اس نے خود شاگرد کو دی کہ یہ احادیث کا مجموعہ ہے اور آپ کو میری طرف سے حدیث کی اجازت ہے، لے لیجیے۔اب اگر یہ بندہ حدیث کی روایت کرے گا تو اسے تسلسل نہیں کہیں گے۔اس لیے کہ محدثین کے نزدیک روایتِ حدیث کے لیے سماع ضروری ہے۔

پیغمبر بہرے کیوں نہیں تھے؟

یہ بھی عجیب بات ہے کہ دنیا میں کوئی بھی پیغمبرؑ بہرے نہیں گزرے۔نابینا تو تھے، بہرے نہیں تھے۔حضرت یعقوبؑ کے بارے میں آتا ہے:

وَابْیَضَّتْ عَیْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ (یوسف:84)

آپؑ حضرت یوسفؑ کی جدائی میں اتنا روئے کہ بینائی چلی گئی۔اسی طرح شعیبؑ کی بینائی بھی چلی گئی تھی۔

تو انبیائے کرام میں سے نابینا تو تھے مگر کوئی بھی بہرے نہیں تھے۔اس لیے کہ علم کا تعلّق ہی سماع کے ساتھ ہے۔

نورِ ہدایت کے حصول کے لیے سننے کی اہمیت:

شریعت نے ہمیں اس بات کا حکم دیا ہے کہ ہم ہدایت کی باتوں کو توجہ کے ساتھ بیٹھ کر سنیں۔عمل کے جذبے کے ساتھ بیٹھ کر سنیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ (الانفال:23)

''اور اگر اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا تو ان کو سننے کی توفیق دے دیتا''

اس لیے ہمہ تن متوجہ ہو کر بیٹھا کریں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ (الروم:23)

اسی لیے جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو اس وقت کے لیے فرمایا:

فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا (الاعراف:204)

''پس سنو اور خاموش رہو۔''

''اچھا سننا'' بھی ایک خوبی ہے۔ورنہ تو آدمی ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ (قٓ:37)

''اس قرآن میں نصیحت ہے ان کے لیے جن کے اندر دل ہو۔''

اور جن کے اندر سِل ہو؟

پہلی خوبی یہ ہے کہ دل متوجہ ہو اور دوسری خوبی کیا ہے؟

اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ (قٓ:37)

''ہمہ تن گوش ہو''

اور تیسری خوبی.....

وَهُوَ شَهِيْدٌ(قٓ:37)

''اور وہ حاضر باش ہو''

تو جب آپ اس طرح بات سنیں گے کہ دل حاضر ہو، ہمہ تن گوش ہوں اور حاضر باش ہوں گے تو اللہ رب العزت کی طرف سے آپ کو ہدایت کا نور ملے گا۔

اس کا نام ولایت ہے:

جو کلمہ پڑھ لیتا ہے وہ بھی ہدایت کے راستے پر ہوتا ہے، لیکن اس کے بعد اس ہدایت میں ترقی کا راستہ بھی کھلا ہوا ہے۔ ان مجالس میں آنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس ہدایت کے نور میں اور بھی اضافہ ہو جائے.....قرآن، عظیم الشان.....اصحاب کہف کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا:

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى (الکھف:13)

اس کا نام ولایت ہوتا ہے۔

اسلام کے ارکان یا۔

اگر بے توجہی سے بات سنیں گے تو فائدہ نہیں ہوگا۔ جیسے ایک بچے کو استاد نے پڑھایا کہ اسلام کے پانچ ارکان ہوتے ہیں۔ جب گھر پہنچا تو باپ نے پوچھا: بیٹا! آج کا سبق کیا تھا؟ کہنے لگا: استاد نے یہ پڑھایا ہے کہ اسلام کے پانچ ''کان'' ہوتے ہیں۔

وہ بھی ذہبی یہ بھی ذہبی:

علامہ شمس الدین ذہبیؒ جو کچھ سنتے تھے ان کو وہ اسی وقت یاد ہو جاتا تھا۔ میں بھی اپنے بعض طالب علموں کو کہتا ہوں آپ بھی علامہ ذہبی ہیں۔ مگر یہ ذہبی ''ذَھَبَ'' سے ہے۔ جو سنتے ہیں، ذھب۔ وہ رخصت ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے ''علامہ ذہبی'' ہیں۔

ایک عجیب دعا:

حضرت مفتی محمودؒ زیارتِ حرمین شریفین کے لیے تشریف لے گئے۔ طواف کیا اور مقامِ ابراہیم پر نفل پڑھ کر ایک عجیب دعا مانگی۔ دعا مانگتے ہوئے کہنے لگے: ''اے اللہ! ساری دنیا مجھے مفتی کہتی ہے، اب تو آپ مجھے مفت میں بخش دیجیے۔''

مفتی کا لفظ تو فتویٰ سے ہے، لیکن چونکہ ایک ذو معنی لفظ تھا اس لیے انہوں نے اس کا اردو زبان میں نکتہ نکال لیا۔

سالک کی پہچان:

سننے کی استعداد کا اچھا ہونا، یہ سالک کی پہچان ہوتی ہے۔ دیکھیں! ابوجہل نے نبی علیہ السّلام کی زبان فیض ترجمان سے معراج کا واقعہ سنا اور قبول نہ کر سکا، جبکہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہی واقعہ کافر کی زبان سے سنا اور اس کو قبول کر لیا۔

طالب علم کے لیے جنت کے راستے میں آسانی کیسے؟

حدیث پاک میں ہے:

مَنْ كَانَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ كَانَ الْجَنَّةُ فِيْ طَلَبِهٖ

''جو انسان علم کی طلب میں ہوتا ہے، جنت اس کی طلب میں ہوتی ہے۔''

ایک اور حدیث پاک میں فرمایا:

''جو اپنے گھر سے علم حاصل کرنے کے لیے نکلا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کے راستے کو آسان کر دیا کرتے ہیں۔''

آسان کرنے کا کیا مطلب؟.....آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو سکولوں کے طلبا ہوتے ہیں، ان کے کارڈ بنے ہوتے ہیں اور جب یہ بسوں پر سفر کرتے ہیں تو ان کو Concetion (رعایت) ملتی ہے۔اس طرح ان کو صرف آدھا کرایہ دینا پڑتا ہے۔اس کو کہتے ہیں سفر میں سہولت کا ہونا۔

اسی طرح جو علم حاصل کرنے والے طلبا ہیں، قیامت کے دن ان کو بھی جنت میں جانے کے لیے کنسیشن (رعایت) مل جائے گی۔اس لیے انسان پوری زندگی ہی علم حاصل کرے۔

انسانی جسم میں علما اور مزدوروں کی بستی:

علم اور عمل میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔حضرت قاری محمد طیبؒ رحمۃ اللہ علیہ اپنے مواعظ میں ایک عجیب بات ارشاد فرماتے ہیں۔وہ فرماتے ہیں کہ انسان کے جسم میں یہ جو اوپر کا حصہ ہے یہ علما کی بستی ہے۔اس میں آنکھیں، کان، دماغ اور زبان شامل ہیں۔اس لیے کہ یہ اعضائے علم ہیں اور انہی اعضا سے انسان علم حاصل کرتا ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ نیچے کا دھڑ مزدوروں کی بستی ہے۔اس میں ہاتھ، پاؤں، پھیپھڑے اور گردے شامل ہیں۔یہ اعضا عمّال (مزدوروں) والے اعمال کرتے ہیں۔اور ان

کے درمیان اللہ تعالیٰ نے دل کو بنایا۔ ان دونوں قسم کے اعضا کا یہ دل حاکم ہوتا ہے۔ گویا سیکریٹریٹ کو درمیان میں بنا دیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب کسی چیز کو ذبح کیا جاتا ہے تو گلے پر چھری پھیرتے ہیں۔ گلے پر چھری پھیرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے علم اور عمل کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ جس بندے کے علم اور عمل کا رشتہ ختم ہو جائے وہ زندہ نہیں، بلکہ مردہ انسان ہوتا ہے۔ زندہ انسان وہی شمار ہوگا جس کے علم اور عمل کے درمیان جوڑ ہوگا۔

لطفِ روحانی میں رکاوٹ:

اللہ تعالیٰ نزولِ قرآن کا مقصد خود ارشاد فرماتے ہیں:

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (قٓ:45)

''پس آپ ان کو وصیت کیجیے قرآن کے ذریعے سے تاکہ یہ اللہ کے وعدے سے ڈر جائیں۔''

تو قرآن مجید کے نازل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کے دلوں میں اللہ کی خشیت پیدا کر دی جائے تاکہ بندے اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان کو سمجھیں اور گناہوں سے بچنے کی کوشش کریں۔ اس مقصد کے لیے انسان کو اپنی خواہشات پر چھری پھیرنی پڑتی ہے۔ سالک کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ حظِّ نفسانی اور خواہشاتِ نفسانی ہیں ؎

نہ جب تک صدقِ دل سے ترک کر دیں حظِّ نفسانی
کبھی بھی آپ کو حاصل نہ ہوگا لطفِ روحانی

لطفِ روحانی حاصل کرنے کے لیے حظِّ نفسانی کو چھوڑنا پڑتا ہے۔

مان کر چلنا سیکھیں:

یہاں تین دنوں کی مختلف مجالس میں آپ نے جو کچھ سننا ہے، وہ اس نیت سے سننا ہے کہ ہم نے اس پر عمل کرنا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ آپ کے تشریف لانے پر شیطان نے آپ کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ آپ اس کو گھر چھوڑ کر نہیں آئے۔ وہ آپ کے ساتھ آیا ہے۔ وہ یہاں بھی کوشش کرے گا کہ آپ کو مقصود حاصل کرنے سے روکے رکھے۔ جب سونے کا وقت ہوگا اس وقت باتوں کا چسکا ڈالے گا کہ جاگو رات کو، گپیں لگاؤ، حالات حاضرہ پر تبصرے کرو۔ اور جب بیان سننے کا وقت ہوگا اس وقت مراقبہ کرنے کی ترغیب دے گا تاکہ سو جائیں۔ ایک کاغذ پر لکھا ہوا نظام الاوقات آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ آپ اس کو پڑھ کر اس کے مطابق وقت کی پابندی کیجیے۔

سونے کے وقت میں آرام کیجیے

کھانے کے وقت کھانے کے لیے جائیے

عبادات کے وقت عبادات کیجیے

آپ نے یہاں ''مان کر چلنا'' ہی تو سیکھنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہاں آنے کے بعد شیطان ہمیں ان مجالس کے فیوض و برکات سے محروم کر دے۔

وقوفِ قلبی کے ساتھ رہیے:

اپنا وقت وقوفِ قلبی کے ساتھ گزاریے۔ وقوفِ قلبی اسے کہتے ہیں کہ اپنی توجہ دل کی طرف اور دل کی توجہ اللہ کی طرف رکھیں

مشغول ہو کر کلمۂ طیب کے ذکر میں دل پہ لگا جو زنگ ہے اس کو چھڑائیے
مشغول اسمِ ذات میں ہوں آپ اس طرح اس کے سوا ہر ایک کو بس بھول جائیے

ان تین دنوں میں اس کی مشق کریں کہ ہم اللہ رب العزت کے سوا ہر ایک کو بھول جائیں۔ ایک اللہ رب العزت کی یاد دل میں ہو اور بس۔

کثرتِ ذکر نرمی کا باعث ہے:

ذکر کی کثرت کی وجہ سے آپ کی ذات میں نرمی آئے گی۔ یہ ذکر کی خوبی ہے۔ جیسے سخت زمین کو بارش کا پانی نرم کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب انسان ذکر کرتا ہے تو انوارات کی بارش انسان کی طبیعت کے اندر نرمی پیدا کر دیتی ہے۔ اور نرم طبیعت کی وجہ سے انسان اچھے اخلاق کا حامل بن جاتا ہے۔

ہڈیوں کے اوپر گوشت کیوں؟

دیکھیں! اللہ تعالیٰ نے ہڈیوں کے اندر سختی رکھی اور اس کے اوپر گوشت اور کھال رکھی۔ یعنی سختی کو نرمی کے اندر چھپا دیا۔ بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے غضب کو بھی اپنی رحمت کے اندر چھپایا ہوا ہے۔

قرآن مجید کا مرکزی پیغام:

اگر قرآن مجید کے الفاظ گنیں تو جو لفظ بالکل درمیان میں آتا ہے، وہ لفظ ہے وَلْيَتَلَطَّفْ (الکھف:19) (نرم گفتگو کرنا) گویا پورے قرآن کا جو مرکزی پیغام ہے وہ نرمی کا پیغام ہے۔

فرعون کے ساتھ نرم گفتگو کرنے کا حکم:

اللہ تعالیٰ موسیٰؑ کو اور ہارونؑ کو فرعون کی طرف بھیج رہے ہیں۔ فرعون بھی کون؟ جو خدائی کا دعویٰ کرنے والا ہے۔ وہ اتنا بڑا سرکش ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (طٰہٰ:44)

”آپ دونوں اس کے پاس جا کر نرم بات کیجیے۔“

اگر ہم بھی اپنے طلبا اور اپنے دوستوں سے ذرا سختی سے بات کریں تو یاد رکھیں کہ نہ تو ہماری شان موسیٰؑ سے بڑی ہے اور نہ ہی سامنے والا فرعون سے برا ہے۔ اللہ تعالیٰ نرمی پر وہ رحمتیں نازل فرماتے ہیں جو سختی پر نازل نہیں فرماتے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر دوست آکر شکوہ کرتے ہیں کہ ہم تو ذکر اذکار کرتے ہیں مگر

بچے نہیں مانتے

بیوی نہیں مانتی

گھر کا ماحول اچھا نہیں

اگر آپ غور کریں تو اس کے پیچھے آپ کی سختی ہوگی اور آپ کے اخلاق میں کمی ہوگی۔ ذکر کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے

انسان میں نرمی پیدا ہو جاتی ہے

پھر اس کے اخلاق اچھے ہو جاتے ہیں

پھر اچھے اخلاق سے انسان دوسروں کے دل میں جگہ بنا لیتا ہے

پھر لوگ دین کے قریب ہو جاتے ہیں

جماعت کا انتظار:

ان تین دنوں میں آپ نے نمازوں کے وقت سے پہلے آکر جماعت کے انتظار میں بیٹھنا ہے۔ یہ سنت بھی آج ختم ہوتی جا رہی ہے۔ آج تو حالت یہ بن گئی ہے کہ اگر پانچ منٹ بھی رہتے ہوں تو مسجد کے باہر آکر آپس میں باتیں کرتے رہیں گے۔ کوئی کہے بھی سہی کہ نماز ہونے والی ہے تو کہتے ہیں: جی! ابھی پانچ منٹ باقی ہیں۔ کتنا اچھا ہوتا کہ مسجد میں آجاتے اور جماعت کے انتظار کا بھی ثواب نصیب ہو جاتا۔

یہ وقت ہمارے پاس امانت ہے:

آپ ان دنوں میں ہمہ تن اللہ رب العزت کی طرف متوجہ رہیں۔ جیسے کسی کو کوئی غم یا فکر لگی ہوتی ہے ایسے ہی بندے کو مغموم نظر آنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ وقت ہم اللہ کی نسبت سے فارغ کر چکے ہیں۔ لہٰذا یہ وقت ہمارے پاس امانت ہے۔ چنانچہ اس وقت کو ہم اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان، توجہ اور حضوری کے ساتھ گزاریں گے تو جاتے ہوئے آپ کا دل گواہی دے گا کہ آپ کو ان تین دنوں میں فائدہ نصیب ہوا ہے۔

رابطہء قلبی اور اس کے فوائد:

ہر وقت دل میں اللہ کی طرف دھیان رکھیے۔ حتی کہ بیان سننے کے دوران بھی اللہ کی طرف دھیان رکھیے۔ البتہ جب شیخ کے سامنے ہوں رابطہ قلبی اور جب شیخ سے دور ہوں تو وقوفِ قلبی کا خیال رکھیں۔ رابطہء قلبی اسے کہتے ہیں کہ اپنے دل کو خالی سمجھیں اور یہ جانیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نبی علیہ السّلام کے قلب مبارک سے اور مشائخ کے قلوب سے ہوتی ہوئی میرے شیخ کے قلب میں آرہی ہے اور وہاں سے یہ میرے دل میں پہنچ رہی ہے۔ یہ آپس میں روحانی رشتے ہوتے ہیں۔ جس طرح سورج کتنی دور ہے مگر اس کی کرنیں پوری دنیا پر پڑ رہی ہوتی ہیں۔

کہیں سبزی کا قد بڑھ رہا ہے

کہیں پھول کا رنگ خوش نما ہو رہا ہے

کہیں پھل کا ذائقہ بہتر ہو رہا ہے

ہر ایک اپنے نصیب کا حصہ پا رہا ہے۔ اسی طرح شیخ کی توجہ بھی سب پر پڑ رہی ہوتی ہے، مگر ہر سالک اپنی طلب کے بقدر اس میں سے حصہ پا رہا ہوتا ہے۔

عشق کی چوٹ تو پڑتی ہے سبھی پر یکساں ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے

جتنی طلب لے کر بیٹھیں گے اللہ تعالیٰ اس پر اتنی ہی نعمت عطا فرمائیں گے۔ چنانچہ اس پورے وقت میں آپ اپنے دل کی توجہ اللہ رب العزت کی طرف رکھیے۔

ہم تم ہی بس آگاہ ہیں اس ربطِ خفی سے معلوم کسی اور کو یہ راز نہیں ہے

تم سا کوئی ہم دم کوئی دم ساز نہیں ہے باتیں تو ہیں ہر دم مگر آواز نہیں ہے

وقوفِ قلبی کے لیے دو معاون چیزیں:

ہمارے مشائخ فرمایا کرتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً یہ الفاظ زبان سے اونچے بھی کہہ دینے چاہییں۔ اس کو انہوں نے بازگشت کہا کیونکہ یہ چیز بندے کو اللہ کی طرف موڑنے میں بڑی آسانی پیدا کر دیتی ہے۔ فارسی کے چند الفاظ ہیں یاد کر لیجیے۔

''خداوندا! مقصود من توئی و رضائے تو، مرا محبّت و معرفت، ذوق شوق خود بدہ''

''یا الٰہی! تو ہی میرا مقصود ہے اور تیری ہی رضا کا طالب ہوں، مجھے اپنی محبّت و معرفت اور ذوق شوق عنایت فرما۔''

اس کو بازگشت کہتے ہیں کہ اگر سالک کچھ کچھ دیر کے بعد ان الفاظ کو پڑھتا رہے گا تو اس کو اس سے وقوفِ قلبی کے لیے آسانی ہوگی۔ اور دوسرا مسنون دعاؤں کے پڑھنے سے بھی وقوفِ قلبی میں آسانی رہے گی۔ اس لیے آپ یہ دو کام اہتمام سے کیجیے۔

اللہ کی تلاش میں سفر کرنے والے:

محترم جماعت! دنیا میں کچھ لوگ کاروبار کے لیے سفر کرتے ہیں، کچھ رشتہ داری کے لیے سفر کرتے ہیں، کچھ خوب صورت مناظر کو دیکھنے کے لیے سفر کرتے ہیں، لیکن آپ نے یہ سفر اللہ کے لیے کیا۔ اللہ

کے ہاں اس نسبت کی بڑی لاج ہے۔ ہمارے مشائخ بہت سفر کر کے جاتے تھے۔

☆ حضرت خواجہ فضل علی قریشیؒ رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ کے پاس تین سو میل کا سفر پیدل طے کر کے جایا کرتے تھے۔ ایک مہینہ جاتے ہوئے لگتا اور ایک مہینہ آتے ہوئے لگتا اور شیخ کے پاس ٹھہرنے کا علیحدہ وقت ہوتا تھا۔

☆ ایک ایسے بھی بزرگ تھے جنہوں نے پوری دنیا کا چکر لگایا۔ حتی کہ ان کا نام جہانیاں جہاں گشتؒ پڑ گیا۔

جب قیامت کے دن یہ حضرات اللہ کے حضور پیش ہو کر عرض کریں گے:

اللہ! ہم نے آپ کی تلاش میں اور آپ کی طلب میں یہ سفر کیا۔ تو وہاں ہمارے نامہء اعمال میں بھی ایک سفر نکل آئے گا کہ اللہ! ہم نے بھی آپ کی تلاش میں ایک سفر کیا تھا۔ باجماعت نماز پڑھنے کی صورت میں اگر ایک قبول ہوتی ہے تو سب کی ہو جاتی ہے۔ اگر اللہ رب العزت نے ان مقبول بندوں کے سفر کو قبول کیا تو ہمارے اس سفر کو بھی قبول فرما لیں گے۔ اس لیے کہ یہ نسبت بلند ہے۔ ہماری حالت تو اس بڑھیا کی سی ہے جو دھاگے کی اٹی لے کر یوسفؑ کو خریدنے کے لیے گئی تھی۔ اس وقت اسے کسی نے کہا کہ آپ تو یوسفؑ کو نہیں خرید سکتیں، کیونکہ بڑے بڑے امیر لوگ آئے ہوئے ہیں۔ وہ کہنے لگی کہ یہ تو مجھے بھی پتہ ہے کہ میں خرید تو نہیں سکتی لیکن پھر بھی اس لیے آ گئی ہوں کہ کل قیامت کے دن جب یہ پوچھا جائے گا کہ یوسفؑ کے خریدار کہاں ہیں تو مجھے بھی اس وقت اللہ کے حضور پیش ہونے کی سعادت نصیب ہو جائے گی۔

اس لیے جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ میری تلاش میں دنیا میں سفر کرنے والے کہاں ہیں تو ان شاء اللہ ہمارے یہ قدم بھی اللہ کے ہاں یقیناً قبول ہوں گے۔ پرودگار ہماری اصلاح

فرمادے۔(آمین ثم آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ